محمد مجیب

اسلام کا جماعتی نظام

جامعہ ملیہ (دہلی) نے اسکاؤٹنگ کی ایک تحریک شروع کی ہے اور اس کے مقاصد اور طریق کار کی مناسب اشاعت کی جارہی ہے، ایسی تحریکیں افراد کے ولولوں کا نتیجہ ہوں تب ہی کامیاب ہوسکتی ہیں اگر ان کی پشت پر تہذیبیں اور تاریخی روایات ہوں تو انہیں بہت جلد عمومیت حاصل ہو جاتی ہے، اس لیے نہیں کہ روایات کی سند لوگوں کو مجبور کر دیتی ہے، بلکہ اس سبب سے کہ یہ روایات طبیعت اور میلانات کا آئینہ ہوتی ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس چیز کو کسی تہذیب کے حاملوں نے ایک مرتبہ پسند کیا ہے، وہ اگر کسی نئی اور زمانے کے لحاظ سے مفید شکل میں پیش کی جائے تو وہ اسے خوشی سے قبول کرلیں گے۔ جامعہ (ملیہ) نے جو نئی تحریک شروع کی ہے، وہ ایک جماعتی منصوبہ ہے، جس کا یہ مطلب ہے کہ وہ پوری جماعت کے لیے ہے ایک یا چند سیاسی یا مذہبی فرقوں کے لیے نہیں ہے۔ اس کے مقاصد کسی اتفاق یا حادثے یا وقتی ضرورت سے اثر لے کر نہیں بلکہ تہذیب اور اخلاق کے ایک اعلیٰ تاریخی معیار کو سامنے رکھ کر مقرر کیے گئے ہیں۔ میں اس وقت بحث کرنا یا وعظ کہنا نہیں چاہتا، کوئی نئے خیالات بھی نہیں پیش کروں گا صرف آپ کو چند باتیں یاد دلاؤں گا جو آپ میں سے بیشتر کو معلوم ہیں۔ آپ کو یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ مسلمانوں کی جماعت شروع سے خود مختار تھی، جن منصوبوں کو ہم اسلامی تہذیب کا جوہر کہہ سکتے ہیں، انہیں جماعت نے بادشاہوں اور ان کی طاقت کا سہارا لیے بغیر پورا کیا، خود اپنی ترقی کی راہیں نکالیں، خود اپنی حفاظت کا انتظام کیا۔ پچھلے زمانوں کے مسلمانوں نے جو کچھ کیا ہے، اس سے ہم بہت بہتر واقف ہوتے، اگر تقلید کے دَور میں اجتہاد کا دروازہ بالکل بند نہ کر دیا جاتا۔ آج کل بھی ہم اپنی روایات کو خوشی اور آسانی سے اپنا رہنما بنا لیتے اگر

ہمیں بحث اور خاص طور پر اصولی بحث کا بے جا شوق نہ ہوتا۔ اصول ہر علم اور ہر کام کے لیے ہوتے ہیں۔ دین اور اخلاق کے بھی اصول ہوتے ہیں، جن کی وضاحت نیک اور مفید زندگی کے لیے لازمی ہے۔ لیکن ان کی وضاحت کرتے وقت ہم منطق سے اس درجہ متاثر ہو سکتے ہیں کہ حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیں اور یہ بھول جائیں کہ بعض باتیں جنہیں دل میں رکھیے تو اکسیر ہوتی ہیں، زبان پر لانے سے بے تاثیر ہو جاتی ہیں اور اصول کا بے تاثر ہو جانا جماعت کے لیے زہر ہے۔ دین کے لیے زندگی، علم کے لیے عمل ویسا ہی ہے جیسے کھیتی کے لیے زمین اور آب و ہوا۔ علم کی کوئی حد مقرر کرنا صحیح نہیں ہے۔ مگر کاشت تو انہیں چیزوں کی ہو سکتی ہے جن کے لیے زمین اور آب و ہوا مناسب ہو، جن کی بازار میں مانگ ہو، جو کسی ضرورت کو پورا کرتی ہوں۔ اس وقت ہمارے لیے صحیح عمل وہ ہے جو ہماری جماعت میں قوت اور یک جہتی پیدا کرے اور اسے سیاسی کشمکش کے نقصان سے محفوظ رکھے، اس لیے ہمیں ان باتوں کا علم ہونا چاہیے جو ہماری جماعتی نظام کی بنیاد تھیں جنہوں نے اس نظام کو مستحکم کیا اور جو ہمیں یقین دلاتی ہیں کہ ہماری جماعت کی ساری قوت پھر بحال ہو سکتی ہے۔ ہم میں وہ لوگ جو چاہتے ہیں کہ اس وقت مسلمانوں کو بتائیں کہ ان کی حکومت کیسی ہونی چاہیے؟ اس وجہ سے بڑی مشکل میں پڑ جاتے ہیں کہ دینی احکامات اور تاریخی واقعات میں بڑا اختلاف ہے۔ یہ مشکل آج کل ہی نہیں بہت زمانے سے محسوس ہو رہی ہے۔ بعض بزرگوں نے یہ دیکھ کر سیاسی حاکم کسی طرح دین اور قانون کی پابندی نہیں کرتے، ان سے الگ رہنے کی تعلیم دی۔ ایسی تعلیم دی جا سکتی تھی، بادشاہوں اور ان کے امراء کے مال کو حرام، ان کے طریقہ کو گنہگاری کا نمونہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ اس لیے کہ لوگ محسوس کرتے تھے کہ سیاسی نظام جماعت کی تنظیم کا صرف ایک پہلو ہے۔ حکومت کرنے والے جماعت کے بے حساب کاموں میں سے صرف چند کے ذمہ دار ہیں۔ اور وہ اگر راہِ راست پر نہیں آتے تو انہیں نظر انداز کرنا چاہیے۔ آج کل ہمیں خیال ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ غلط تھا۔ مسلمانوں کو شاہی حکومت گوارا نہیں کرنی چاہیے تھی بلکہ جمہوریت کے ان اصولوں کو برتنا چاہیے تھا جن کی مثال پیغمبر اسلام اور خلفائے راشدین نے قایم کی تھی۔ مگر ہم بیشتر سیاسی تاریخ

پڑھتے ہیں۔ اس کو پوری سرگرمیوں کا خلاصہ سمجھتے ہیں۔ اور وہ مقاصد جنہوں نے ہمارے بزرگوں کو مصروف رکھا ہماری نظروں سے چھپے رہتے ہیں۔ ہمارے بزرگ دراصل تصورات، قوانین اور اخلاق میں اس کی ترجمانی کرنا چاہتے تھے، ان کے لیے کافی تھا اگر جماعت ان کے خیالات کو پسند اور قبول کرتی یا کم از کم ان پر غور کرتی۔ حاکموں نے یہ مان لیا کہ حکومت شریعت کی تابع ہے تو ان لوگوں کے لیے جو علم اور عمل کا نمونہ بننا چاہتے تھے، سیاست میں کوئی کشش نہیں رہ گئی۔ وہ حکومت کے لیے جبر کو لازمی سمجھتے تھے اور اس سے ان کی طبیعت بھاگتی تھی۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ حاکم اپنے حال پر چھوڑ دیئے گئے تو اس سے کیا نقصان پہونچیں گے۔ بلکہ دوسروں کا ظلم سہنا بہتر جانا۔ اس سے کہ خود جبر کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی اور معاشی تنظیم کا اختیار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہا جو اسلام اور جماعت کا حق ادا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ زکوٰۃ حکومت کی آمدنی کا ذریعہ بن گئی اور اس کا بہت ہی حقیر حصہ ایسے کاموں میں صرف ہوتا تھا جس کے لیے زکوٰۃ مخصوص ہے۔ دولت، نسل اور خاندان کے وہ امتیازات جنہیں اسلام مٹانا چاہتا تھا، سیاسی مصلحتوں کی خاطر قایم رکھے گئے۔ بنو امیہ کی حکومت عربوں کی غیر عربوں پر حکومت تھی اور بنو عباس جس انقلاب کی بدولت برسرِ اقتدار ہوئے وہ اپنے معاشرتی اور اخلاقی مقاصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ مسلمانوں کے بیشتر فرقے اور خلافت کی ساری کمزوریاں اسلام کی تعلیم کو سیاسی غرض اور مصلحت پر قربان کرنے کا نتیجہ ہیں۔ اب تحقیق کرنے سے رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے کئی فرقے جو اپنے عقائد کی وجہ سے مردود قرار دیئے گئے، اسلام کی کسی نہ کسی بڑی قدر کے حامل تھے۔ قرامطہ نے جو سب سے زیادہ بدنام ہیں، اپنے فرقے کی جو معاشی تنظیم کی وہ عدل اور افراد کے باہمی ربط کا ایک بیش بہا نمونہ ہے کہ اس میں کسانوں اور صنعت پیشہ لوگوں کو وہ حق اور امتیاز اور مرتبہ دیا گیا جو ان کا حصہ ہے اور اسلام کا مطالبہ شریعت کے عالم تو صرف اس حقیقت کو واضح کر سکے کہ جماعت کا مدار اتحاد پر عمل ہے نہ کہ مقابلہ پر۔ اس لیے صنعت اور تجارت کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوں، یہ نہ ہونا چاہیے کہ ہر شخص کسی کی ضرورت اور کسی کی محنت سے فائدہ اُٹھا کر اپنے لیے دولت جمع کرے۔

تمام امکانات کو دیکھئے تو یہ کارگزاری بہت تھوڑی معلوم ہوتی ہے۔ اس پر غور کیجئے کہ دنیا آزاد مقابلے کے مسئلہ نے کیا ستم ڈھائے ہیں تو اس کا یقین ہو جائے گا کہ ہماری شریعت نے تعلیم نے معاشی زندگی کا سب سے اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔ ہمارے زمانے میں سیاست کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے اور اب ایسے جماعتی نظام کا تصور کرنا مشکل ہو گیا ہے جو سیاست سے بالکل بے تعلق ہو۔ مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حکومت ان جماعتوں کو ہی فائدہ پہنچا سکتی ہے جو منظم ہوں اور وہی جماعتیں اس کی زیادتیوں سے محفوظ رہ سکتی ہیں جن میں تنظیم اور یک جہتی ہو۔ ہمیں سیاست میں پورا حصہ لینا چاہیے۔ لیکن اس سیاست کی پشت پر ایسا نظام اور ایسے مقاصد ہونا چاہئیں جو ہر سیاسی خیال کے لوگوں کو اپنے خیال کے مطابق جماعت کی خدمت کا موقع دیں۔ اتحاد ہم سب چاہتے ہیں۔ جماعت کی خدمت بھی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس کا یقین بہت کم لوگوں کو ہے کہ خارجی امداد اور ایک نامعلوم انقلاب کے بغیر ہماری جماعت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے گی۔ ہمیں خلفاء اور بادشاہوں کے نام اور ان کے کارنامے یاد ہیں۔ یہ یاد نہیں کہ ان کی قوت جماعت کے زورِ بازو کی علامت تھی۔ ان کے کارنامے جماعت کے حوصلے کی مثالیں ہیں۔ اس لیے اپنی سیاسی تاریخ پر غور کرتے وقت ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ حق دار کو اس کا حق دیں۔ تہذیب کی تاریخ کا مطالعہ کریں تاکہ وہ غلط فہمی دور ہو جائے جو صرف سیاسی تاریخ پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے اور ہمیں معلوم ہو کہ ہماری جماعت حاکموں کی مدد کے بغیر اور کبھی ان کی مرضی کے خلاف کیا کچھ کر چکی ہے۔

پہلا کام جو مسلمانوں نے کیا، وہ ان قوانین کی وضاحت تھی جن کے تحت ان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی بسر ہوتی تھی۔ دراصل یہ کام پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ شروع ہوا اور اب تک جاری ہے۔ مگر ایک خاص زمانہ تھا جب اس کی طرف بہت توجہ کی گئی۔ عقائد کے تعین اور شریعت کی تدوین میں سیاسی حاکموں سے کوئی مدد نہیں لی گئی اور ان کی مداخلت سے ہمیشہ نقصان اور فساد ہی ہوا۔ جماعت نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں فقہ کی ترتیب و تدوین کا سارا کام خود ہی کیا۔ اور اسلامی دنیا کی وسعت کو دیکھتے ہوئے، یہ ایک معجزے سے کم نہیں کہ

علماء کے اپنے اپنے طور پر مطالعہ اور غور وفکر کرنے سے اور بغیر کسی درمیانی وسیلے کی شرع اسلامی جیسی جامع ومکمل چیز مرتب ہوگئی۔ خلفاء کو اپنی رائے پر عمل کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ علماء صرف تعلیم دیتے، کتابیں لکھتے، سوالوں کے جواب دیتے۔ جماعت ان کی رائے کو اہمیت دیتی تھی، ان کی رائے ایک حکم کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کا ماننا لازمی سمجھا جاتا تھا۔ اگر اس کے خلاف کوئی اور زیادہ مستند اور قابلِ قبول رائے حاصل نہ کی جاتی، علماء کی ضدیں اور مخالفتیں مشہور ہیں۔ تقلید کے دور میں یہ مخالفتیں بڑی حد تک بے معنی ہوگئیں۔ لیکن آپ یہ دیکھئے کہ عیسائیوں نے ایسی ہی مخالفتوں کی وجہ سے ایک روس پر کتنا ظلم کیا تو آپ اپنی جماعت کی رواداری اور سلامت روی پر فخر کریں گے۔ ہماری جماعت نے ہر شخص کی رائے کو اہمیت دی۔ اس لیے کہ جماعت کے قانون کا دارومدار اتفاقِ رائے پر تھا۔ اصولاً نہیں تو عملاً آخری فیصلہ وہی کرتی تھی اور اجماع کا سند کے طور پر مسلم ہونا اسی کی دلیل ہے۔ اجماع کے مطلب پر بزرگوں میں بہت بحث ہو چکی ہے۔ میرے لیے اس میں شریک ہونا مناسب نہیں، مگر اس پر علماء کی اکثریت متفق ہوگی کہ اجماع کے تصور میں جماعت اور عام رائے کو ایک ہی مرتبہ دیا گیا ہے۔ جو نیابتی حکومت سے پہلے کسی جماعت کو حاصل نہیں تھا۔

مسلمانوں کی جماعت کے بہت سے حقوق چھن گئے۔ مگر شریعت کو نافذ کرنے کی کوشش وہ برابر کرتی رہی۔ بادشاہ اور دوسرے حاکم شریعت کے عالم نہیں ہوتے تھے اور اپنی مصلحتوں کو شریعت کا پابند نہیں کرنا چاہتے تھے۔ شریعت کی محافظ اور اس پر عمل کرنے اور کرانے کی ذمہ دار خود جماعت تھی اور جماعت اس فرض کو انجام دیتی رہی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خودغرض یا فتنہ وفساد کو پسند کرنے والے لوگ مجمعوں کو مشتعل کر کے انہیں اپنا آلۂ کار بنا سکتے تھے اور ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے جب جماعت نے اپنے اختیار سے نامناسب طریقے پر کام لیا، لیکن جماعت فعل کے ساتھ عمل کو بھی دیکھتی رہی۔ نتائج کو جانچتی رہی۔ اس نے افراد کو اتنی آزادی نہیں دی کہ جماعت کے نظام کو اپنی کسی رائے کی بنا پر برباد کر دیں۔ لیکن انہیں اتنا اختیار دیا کہ اپنے اصولوں کو اپنی ذاتی زندگی میں برتیں اور اس طرح ان کا مفید ہونا ثابت

کریں۔شریعت نے ہم میں ہر ایک شخص کو یہ حق بھی دیا ہے کہ وہ محتسب بنے، اچھی بات کا حکم دے، بری بات سے منع کرے اور ہم اتنے عرصے تک اس طریقے کو برتتے رہے ہیں کہ وہ ہماری طبیعت میں داخل ہو گیا ہے اور اس سے ناگوار صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں۔ مگر جن افراد کا یہ عقیدہ ہے کہ جماعت کا ایک مقرر اور معلوم نظامِ زندگی ہونا چاہیے، وہ بے تکے سوالات کو اس بے پروائی پر ترجیح دیں گے جو انتشار اور بے حسی کی علامت ہے۔ اعتراض کرنے والوں کی نظر عموماً چھوٹی اور ظاہری باتوں پر پڑتی ہے۔ اور زندگی کی ادنیٰ تفصیلات پر جو نکتہ چینی کی جائے اس سے زیادہ وحشت ہوتی ہے۔ ہماری جماعت نے تفصیلات پر کچھ زیادہ توجہ کی تو اہم اور غیر اہم کے فرق کو بھی یاد رکھا۔ اگر اپنے کسی خادم کو غیر کا مقلد اور جماعت کا دشمن سمجھا تو بعد میں اس کی تلافی بھی کر دی۔ ایسی انفرادیت جو خدمت سے انکار کرے، جماعت کے لیے ایک بڑا خطرہ ہوتی ہے اور جماعت کے پاس معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا کہ وہ انفرادیت جو زندگی کی تفصیلات میں نظر آتی ہے، کسی بڑی اور موثر شخصیت کی نشانی ہے یا محض آزادی کی نمائش کسی اصلاح کا پیش خیمہ ہے یا بگڑی طبیعت کی ایک ادا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر ایک جماعت جس میں ہر درجے کے عالم اور جاہل شامل ہوں، کسی جدت کے بارے میں غلط رائے قائم کرے۔ نقصان تو اس وقت ہوتا ہے جب وہ غلطی پر قائم رہے۔ پچھلے ستر اسی برس میں ہماری جماعتی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب آیا ہے اس کا سبب چند شخصیتیں ہیں، جنہیں ہماری جماعت نے پہلے مخالف کر کے آزمایا اور پھر تائید کر کے انہیں کامیاب کیا۔ اس طرح ہماری جماعت نقصان سے بچی رہی، اس لیے کہ ہمارے معترض صرف اصولی بحث کرنے والے لوگ نہیں تھے بلکہ اکبر الہ آبادی مرحوم جیسے شاعر بھی جن کا ہنسنا اور رونا، غم اور غصہ سب ایک دل کی کیفیتیں تھیں جو درد اور محبت سے لبریز تھا۔

شریعت ایسے عقائد اور قوانین کا مجموعہ ہے جو اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہیں، ہماری جماعت اپنی شریعت کی حفاظت کرتی رہی۔ مگر اسے اپنے لیے ایک قید خانہ نہیں بنایا اور ان لوگوں کا ادب و احترام کرتی رہی جو یہ کہتے تھے کہ شریعت کی پابندی اصل دین نہیں ہے

صرف اس کی ظاہری شکل ہے۔ ایسے لوگوں کی دو بڑی قسمیں تھیں۔ ایک تو وہ تھے جو سماجی زندگی میں بہترین اخلاقی نمونہ پیش کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد سے ہم خیال لوگوں کی جماعتیں بنا لیتے تھے۔ یہ طریقہ فتوت کہلاتا تھا اور اس کے برتنے والے اہلِ فتوت۔ دوسری قسم صوفیوں کی تھی، تصوف کی خصوصیات بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا اور اہلِ دنیا سے کنارہ کشی صوفیوں کا کوئی عام اور مسلم اصول نہیں تھا۔ شیخ سری سقطی جو نویں صدی عیسوی کے ایک بزرگ ہیں، ایک پیرزادے کے بارے میں فرماتے ہیں جو دنیا سے بھاگ کر پہاڑوں میں رہنے لگے تھے کہ:

''وہ تو پہاڑ میں ساکن ہو گئے ہیں اور یہ کوئی جوانِ مردی نہیں ہے، مرد ایسا ہونا چاہیے کہ بازار میں رہ کر حق تعالیٰ کے ساتھ ایسا مشغول ہو کہ اس سے غائب نہ ہو۔ صوفی کی اصل شان یہ تھی کہ دنیا میں رہے اور ان معاملات کے علاوہ جو اس کے اور حق تعالیٰ کے درمیان تھے، اپنے قول و عمل کو پاک زندگی کی جیتی جاگتی مثال بنائے۔ ظاہر میں فتوت اور تصوف کے درمیان کوئی نمایاں فرق نہیں تھا۔ فتوت میں تہذیب کا، تصوف میں دین کا عنصر غالب تھا۔ جماعتی زندگی کو زینت اور تقویت دونوں کی بدولت حاصل ہوئی۔

فتوت اور تصوف کے سلسلے میں بہت سی اصطلاحیں آتی ہیں، جن کے معنی رفتہ رفتہ اس قدر بدل گئے ہیں کہ اب وہ بے معنی ہو گئی ہیں، ان میں سے بعض کا جو فتوت اور تصوف دونوں میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، کسی قدر سمجھنا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک نفس ہے، دینیات، فلسفہ اور تصوف میں یہ اصطلاح مختلف اور متضاد معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔ اور میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا کون سا استعمال صحیح اور کون سا غلط ہے۔ عام طور پر اس سے مراد وہ خواہشیں ہوتی ہیں جن کا پورا کرنا دین یا اخلاق کی رو سے غلط ہے لیکن یہ خواہشیں انسان اپنی جہالت یا حماقت سے پیدا نہیں کرتا۔ یہ اُسے قدرت کی طرف سے ملی ہیں اور ان میں سے بعض مادی زندگی کی اساس ہیں، اسی وجہ سے وہ روحانیت جس کی خاطر نفس کو مارنا ہو تو فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ دین اور فطرت کا یہ تضاد دور ہو جاتا ہے اگر ہم نفس کو خواہشوں کا مجموعہ

نہ فرض کرلیں، بلکہ وہ میلان جو انسان کو اپنی ذات کی طرف متوجہ کرتا ہے، اسے جماعت میں محو ہونے کی بجائے جماعت سے الگ ہونے پر آمادہ کرتا ہے، اسے یہ سکھاتا ہے کہ جماعت کے وجود سے اس کا الگ اپنا ایک وجود ہے، جماعت کے فائدے سے الگ اس کا اپنا ایک فائدہ ہے، اگر یہ میلان قوی ہو تو انسان اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کی فکر میں پڑ جاتا ہے۔ شریعت میں حیلے کرتا ہے، خدا سے سودا کرتا ہے۔ اور دنیا میں چور کی طرح رہتا ہے، لیکن اگر کوئی تعلیم یا کسی شخصیت کا اثر انسان کو یقین دلا دے کہ اپنی ذات کو ایک سوراخ بنا کر اس میں چوہے کی طرح چھپ کر بیٹھنے سے وہ لطف اور وہ آسودگی نصیب ہی نہیں ہوسکتی جو آزاد زندگی کا حصہ ہے، تو پھر وہی خواہشیں جو آدمی کو چور اور مکار بناتی ہیں، اس کی پیشانی کو روشن، اس کی نظر کو دلیر، اس کے دل کو شوق، اور وجد کی کیفیتوں کا خزانہ بنا دیتی ہیں۔

تصوف کی اصطلاح میں ایسا شخص توبہ کر لیتا ہے، یعنی اس کا عہد کرتا ہے کہ اعلیٰ کو ادنیٰ پر، بزرگ کو حقیر پر قربان نہ کروں گا۔ آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اس توبہ کا گناہ یا گناہ کی نیت سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ یہ صحیح اور اچھی زندگی بسر کرنے کا ارادہ ہے جو اس سے بچنے اور بچنے سے پورا نہیں ہوتا۔ بلکہ دل اور دماغ کو ایسے کاموں میں مصروف رکھنے سے جو اپنے لیے خواہش کرنے کی عادت ہی چھڑا دیتے ہیں، بیشک اچھی زندگی بسر کرنے کا ارادہ مضبوط ہونا چاہیے اور اس میں پختگی، خلوص اور صدق کی بدولت پیدا ہوتی ہے، لیکن توبہ کی طرح خلوص اور صدق سے بھی مراد نفس اور خواہشوں کو مارنے کے طریقے نہیں ہیں۔ یہ ایسی قوتوں کو بیدار کرنے کے ذریعے ہیں جو آدمی کو سچا اور پورا آدمی بناتی ہیں۔ آدمی اپنی قوت کو صرف میں لانے سے طاقتور ہوتا ہے۔ اخلاق کو مستحکم کرنے کے لیے سخاوت ضروری ہے۔ سخاوت کے معنی صرف یہ نہیں کہ بھوکے کو کھلایئے، فقیر کو خیرات دیجئے اور ہاں چندہ مانگنے والوں کو چندہ دیجئے۔ ہم اگر خودغرضی کی ایسی کیفیت کو معیار مانیں جس میں آدمی اپنی ذات اور اپنی ملکیت پر کسی کا کوئی حق تسلیم نہیں کرتا تو اتنا دے دینا بھی سخاوت ہے۔ دراصل سخاوت اس جذبہ کی پرورش کا نام ہے، جو انسان کو مانگنے والے کی بجائے دینے والا بنا دیتا ہے۔ انسان دیتا ہی رہے تو پھر اس

کے پاس رہ کیا جاتا ہے؟ یقین کی ایک کیفیت جسے توکل کہتے ہیں، یہ قناعت سے بہت بلند درجہ رکھتی ہے کہ اس میں آدمی ان چیزوں کو کافی نہیں سمجھتا جو اسے میسر ہوں بلکہ اپنے آپ کو ہر چیز سے محروم کر کے اس کا دعویٰ کرتا ہے کہ اسے ہر چیز مل گئی۔ اس نظام کے برحق ہونے کا اقرار کرتا ہے، جس میں سب سے زیادہ دولت مند وہ ہے جو سب سے زیادہ دے سکے اور سب سے زیادہ محتاج وہ ہے جو اپنے ہی لیے مانگے اور اپنے ہی پاس رکھنا چاہے۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ میرا مقصد نصیحت اور تلقین کرنا نہیں ہے، اور اب مجھے ڈر ہے کہ آپ کہیں گے کہ میں وعدہ خلافی کر رہا ہوں۔ اس میں صرف میرا قصور نہیں ہے۔ اسلام منتشر اور ایک دوسرے سے بے تعلق افراد کا مذہب نہیں ہے۔ لیکن دینیات اور اخلاق کی بیشتر اصطلاحوں کا جو مفہوم عام طور پر سمجھا جاتا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کا خدا سے براہِ راست معاملہ ہے۔ جماعت کا کوئی حق اور حصہ، کوئی منصب اور مرتبہ نہیں۔ اس طرح عمل کا میدان بہت تنگ ہو جاتا ہے، اتنا ہی تنگ جتنا کہ خود غرض آدمی کا دل۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے دین کو مانتے ہیں، مگر اس کے اصولوں کو برتنے سے معذور ہیں۔ میں نے شریعت اور اس سے متعلق چند امور کی مثال دے کر یہ دکھانے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کی جماعت نے کس طرح اپنے نظامِ زندگی کو مرتب کیا اور پھر میں یہ بیان کرنا چاہتا تھا کہ ان لوگوں نے جو شریعت پر عمل کرنا کافی نہیں سمجھتے تھے، کیا طریقہ اختیار کیا۔ اس سلسلے میں فتوت اور تصوف کا ذکر آیا اور ان اصطلاحوں کی تھوڑی سی وضاحت کرنا ضروری ہوا، جس کے معنی پہلے بہت وسیع تھے اور اب بہت محدود ہو گئے ہیں۔ جب تک ہم اس فرق کو ذہن نشین نہ کر لیں تو ہمارا دین اصطلاحوں میں بند رہے گا۔ ہماری جماعت کو افراد سے اور افراد کو جماعت سے کچھ فیض نہ پہنچ سکے گا اور فتوت اور تصوف جیسے مسلک ہمارے لیے معمہ بنے رہیں گے۔

فتوت کے بارے میں ابھی تک اتنی تحقیق نہیں کی جا سکتی ہے کہ ہم اس کا صحیح اندازہ کر سکیں کہ اس کا کتنا چرچہ تھا۔ ابنِ بطوطہ نے اپنے سفر نامے میں ایسی جماعتوں کا ذکر کیا ہے، جن کے اراکین جو صنعت پیشہ لوگ تھے، ایک خانقاہ میں ساتھ رہتے تھے اور اپنی کمائی پر گذر

کرتے تھے، جماعت کے اراکین فتیان کہلاتے تھے، ان کا سردار اخی، ان کا ایک مخصوص لباس تھا، ایک خاص عہد، جس کی ہر حال میں پابندی کی جاتی تھی، ان کی تواضع اور سخاوت مشہور تھی، لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ ظالم حاکموں اور ان کے کارندوں کی مخالفت کرنے میں ان سے زیادہ مستعد اور جاں باز کوئی نہیں۔ ابنِ بطوطہ کا زمانہ چودھویں صدی عیسوی ہے، اس سے قریب سوا سو برس پہلے خلیفہ الناصر لدین اللہ نے ایسے لوگوں کی ایک جماعت بنائی جنہوں نے فتوت کا عہد لیا تھا۔ ان لوگوں کا جماعت میں داخلہ ایک خاص رسم ادا کر کے ہوتا تھا اور داخلے کے بعد وہ اپنے آپ کو ممتاز کرنے کے لیے کوئی مخصوص لباس پہنتے تھے۔ یہ سیاسی اور سرکاری فتوت ایک زیادہ بڑی اور مفید تحریک کا عکس تھی جسے حکومت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ فتوت کے کوئی ایک معنی نہیں ہیں۔ جیسے شرافت کسی ایک بات میں نہیں ہوتی اور اس کا فیصلہ لوگ اپنی طبیعت کے مطابق کرتے ہیں کہ وہ اپنی فتوت کو کس طرح نمایاں کریں گے۔ علامہ (ابوالقاسم) قشیری نے اپنے رسالے (القشیریہ) میں بہت سی رائیں اور مثالیں دے کر فتوت کے مفہوم کو واضح کیا ہے۔ فتوت کے لفظی معنی جواں مردی کے ہیں لیکن اس کا تعلق شجاعت سے زیادہ سخاوت اور ایثار سے ہے۔ اصلی فتوت یہ ہے کہ انسان دوسرے کے کام میں مدد دے۔ آنحضرت صلعم سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی حاجت پوری کرتا ہے، جب تک وہ بندہ اپنے مسلمان بھائی کی حاجت میں مددگار رہے۔ فتوت نام ہے، لوگوں کی غلطیوں کو نظر انداز کرنے کا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ فتوت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسرے سے برتر نہ سمجھے۔ ابوبکر وَراق کا قول ہے کہ اہلِ فتوت وہ ہے جس کا کوئی دشمن نہ ہو۔ حضرت حارثؒ محاسبی کا قول ہے کہ فتوت یہ ہے کہ تم خود اپنے معاملات میں انصاف سے کام لو، اور کسی دوسرے کو اس میں انصاف کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ عمرؒ بن عثمان مکی کہتے ہیں کہ فتوت حسنِ خلق کا نام ہے۔ نصیر آبادی نے کہا ہے کہ مروّت فتوت کی ایک شاخ ہے اور فتوت نام ہے، دونوں جہان سے روگرداں ہو جانے اور ان سے دور بھاگنے کا۔ حضرت جنید بغدادیؒ کا قول ہے کہ فتوت نام ہے اس بات کا کہ انسان کسی کو آزار نہ پہنچائے اور اپنا مال خرچ کرتا رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ فتوت کا مفہوم ہے،

وفاداری اور عیب پوشی۔ بعض نے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ انسان لوگوں پر مہربانی کرے اور پھر اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھے۔ ایک صاحب نے یہ بھی کہا کہ فتوت یہ ہے کہ نہ جمع رکھے اور نہ معذرت کرے اور کہا گیا ہے کہ فتوت یہ ہے کہ نعمت ظاہر کی جائے اور مصیبت چھپائی جائے۔ اور بعضوں نے کہا ہے کہ فتوت امتیاز مٹا دینے کا نام ہے۔

فتوت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لیے علامہ قشیری نے طرح طرح کی مثالیں بھی دی ہیں:

ایک صوفی نے اپنی جماعت کی دعوت کی، ان میں ایک شیخ شیرازی بھی تھے، جب سب کھانا کھا چکے اور قوالی شروع ہوئی تو سب کے اوپر نیند طاری ہوگئی۔ شیخ شیرازی نے دعوت دینے والے سے پوچھا کہ سماع میں ہمارے سو جانے کا کیا سبب ہے۔ اس نے کہا کہ جو چیزیں میں نے آپ لوگوں کو کھلائی ہیں ہر ایک کی بابت اچھی طرح جانچ لیا تھا۔ سوائے بینگن کے۔ جب صبح ہوئی تو وہ لوگ کنجڑے کے پاس گئے اور پوچھا جو بینگن تم نے کل دیئے تھے، وہ کہاں سے لائے تھے، اس نے کہا کہ بات یہ ہے کہ کل میرے پاس کوئی بینگن نہیں تھا، میں نے فلاں کھیت سے چرا کر دعوت کرنے والے کے ہاتھ بیچا۔ وہ لوگ اس کو اپنے ساتھ کھیت والے کے پاس لے گئے کہ اس سے معاف کرائیں۔ (یہ اہلِ فتوت میں سے تھا) اس نے کہا کہ میں نے یہ کھیت ہی اس شخص کو بخش دیا۔ اور اس کے ساتھ دو کھیت اور، اور ایک گدھا، اور کھیتی کے اوزار تا کہ وہ پھر ایسی حرکت نہ کرے۔

ایک شخص نیشاپور کانسا میں گیا وہاں ایک آدمی نے اس کی دعوت کی اور ساتھ ہی چند اربابِ فتوت کی بھی۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو ایک لونڈی ہاتھ دھلانے کے لیے لوٹے سے پانی گرانے لگی۔ نیشاپوری نے ہاتھ روک لیا اور کہا یہ فتوت کے خلاف ہے کہ عورتیں مردوں کے ہاتھ پر پانی ڈالیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں سالہا سال سے اس گھر میں دعوت کھانے آتا ہوں اور مجھے پتہ نہیں کہ میرے ہاتھ پر عورت پانی ڈالتی ہے یا مرد۔ شفیق بلخی نے امام جعفرؒ ابن محمدؒ سے فتوت کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے کہا پہلے تم بتاؤ۔ شفیقؒ نے کہا

کہ اگر ملے تو شکر کرے اور اگر نہ ملے تو صبر کرے۔ امام نے فرمایا کہ یہ تو ہمارے مدینے کے کتے بھی کرتے ہیں۔ فتوت یہ ہے کہ اگر ملے تو ایثار کرے اور نہ ملے تو شکر کرے۔

فتوت کے سلسلے میں علامہ قشیری نے آخر میں جو رائے دی ہے، وہ ہمارے زمانے کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جاننا چاہیے کہ اصلی فتوت دوستوں کی عیب پوشی ہے، خاص کر ایسے عیبوں کی جن سے دشمن کو ہنسنے کا موقع ملے۔ آپ کو معلوم ہے کہ شرعی احکامات اور ان اعلیٰ مصلحتوں کے لحاظ سے جو شرعی احکامات کی بنیاد مانی جاتی ہیں، ہر مسلمان کے لیے باقی تمام مسلمانوں پر حقوق ہیں۔ امام غزالیؒ نے احیاء علوم میں ۲۶ ایسے حقوق کی تفصیل دی ہے، ان میں بعض کا تعلق میل جول کے معمولی آداب سے ہے۔ بعض اجتماعی زندگی کی جان ہیں۔ پہلا اور ہر معاملے میں حق یہ ہے کہ ہر مسلمان دوسرے کے لیے وہی چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہو اور اس کے لیے وہی بات بری سمجھے جو اپنے لیے بری سمجھتا ہو۔ اسے کسی کو اپنے قول و فعل سے ایذا نہیں دینا چاہیے۔ ہر ایک پر حتی الامکان احسان کرنا چاہیے اور اس میں مستحق اور غیر مستحق کا فرق نہ کرنا چاہیے۔ اس کے عیبوں کو چھپانا، کسی کے بارے میں بری بات سننے میں آئے تو اسے بھول جانا، خیر خواہی کرنا اور خوشی پہنچانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ مسلمان کے لیے مناسب نہیں ہے کہ امیروں کے پاس بیٹھے، اسے مساکین سے اختلاط اور یتیموں سے سلوک کرنا چاہیے۔ اس کا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمان بھائی کی عزت اور جان کو ظالموں سے بچائے۔ چونکہ ہمسایوں سے ہر وقت سابقہ رہتا ہے، ان کے حقوق ادا کرنا اخوتِ اسلامی سے بھی سوا ہے۔ ان کی مدد اور دستگیری کرنا، ان کی عدم موجودگی میں ان کے گھر اور مال کی حفاظت کرنا اور جو امر دنیاوی اور دینی، انہیں معلوم نہ ہوں، وہ انہیں ٹھیک ٹھیک بتانا چاہیے۔ ہمسائیگی سے بڑھ کر دوستی اور محبت فی اللہ کا درجہ ہے۔ یہ رشتہ شریعت اور قانون کے مطالبوں سے الگ اور برتر ہے، اسے وہ لوگ جو چاہتے، آپس میں قائم کرتے تھے اور اس میں مقصود یہ تھا کہ دوست کے مقابلے میں اپنی ذات نیست و نابود کر دی جائے۔ شیخ ابوالحسن نوری کا قصہ مشہور ہے کہ خلیفہ سے کسی نے ان کی اور ان کے چند دوستوں کی چغلی کھائی اور اس نے سب کی گردن

مارنے کا حکم دیا، جب جلاد آیا تو شیخ ابوالحسن نوری سب سے پہلے اس کے سامنے کھڑے ہوئے اور کہا کہ پہلے مجھے قتل کرو۔ اس نے وجہ پوچھی تو آپ نے جواب دیا کہ میں چاہتا ہوں کہ اس لحظہ اپنی زندگی اپنے بھائیوں کی زندگی پر مقدم کروں۔ محبت فی اللہ قائم کرنے کا رواج زیادہ تر صوفیوں میں تھا۔ لیکن دوستی کا جو مرتبہ اسلامی جماعت کے اخلاق میں دیا گیا وہ دنیا کی کسی تہذیب میں نظر نہیں آتا، عام مسلمانوں، ہمسایوں اور دوستوں کے حقوق کو ذہن میں رکھ کر فتوت کی ان باتوں پر غور کیجئے جو میں ابھی بیان کر چکا ہوں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ مسلمانوں کی جماعت نے اپنی شیرازہ بندی کیسے لطیف اور موثر طریقے سے کی تھی۔

ہم لوگ فتوت کا نام تک بھول گئے ہیں۔ تصوف کی اب بھی عزت کی جاتی ہے، مگر احترام کے اس جذبہ کا جماعت کے حقوق اور اس کے مفاد سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہماری عقیدت کا سبب کرامات کی روایتیں ہیں۔ جماعت کی اصلاح اور رہنمائی کے وہ منصوبے نہیں ہیں، جن میں صوفی دراصل مشغول رہا کرتے تھے۔ تصوف کا میلان کسی نہ کسی حد تک ہر شخص میں ہوتا ہے، مگر ایسے لوگ تھوڑے ہی ہوتے ہیں، جن کا اصل محرک یہی میلان ہو، صوفیوں کی جماعتیں نسبتاً تھوڑے سے لوگوں پر مشتمل تھیں، جو اپنے روحانی رشتے کو طرح طرح سے مضبوط کرتے رہتے تھے۔ ان کی زندگی لوگوں کی نظروں کے سامنے تھی اور لوگوں کی نیت اور عمل کا سارا حال انہیں معلوم تھا، ان کا کام لینا نہیں تھا، دینا تھا۔ یہ مستحق اور غیر مستحق میں تمیز نہیں کرتے تھے۔ ان کے احسان کے ساتھ کوئی شرط نہیں تھی۔

دنیا میں بے شک ایسے لوگ ہیں جنہیں صرف دوسروں کی نیکی سے فائدہ اُٹھانا آتا ہے۔ مگر شاید ایسے لوگ تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں جن پر اچھی مثال کا اثر پڑتا ہے۔ صوفیوں کی سب سے بڑی خدمت یہ تھی کہ انہوں نے مذہب اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کو عام مسلمانوں کے سامنے رکھا اور ان کا اس خلوص اور شوق سے اقرار اور ثبات کرتے رہے کہ کوئی ان سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

اب میں پھر اسی مطلب پر آ گیا جس سے یہ مضمون شروع ہوا تھا۔ جامعہ سکاؤٹنگ

کی تحریک بالکل نئی ہے۔ اس کی اصطلاحیں انوکھی ہیں۔ اس کا طریقِ کار زمانے کے مناسب، یہ صرف اس بھروسے پر شروع کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی جماعت میں اتنی توفیق ہے کہ وہ اپنی ترقی اور استقلال کی تدبیریں خود کر سکے، اپنی سیاست کو اپنے اجتماعی کاموں کا ایک شعبہ قرار دے سکے۔ اجتماعی کاموں کو سیاست پر منحصر نہ کرے، آپ کی مدد سے اس تحریک کو فروغ ہوا تو یہ شریعت سے ایک نئی محبت پیدا کرے گی۔ فتوت کی مشق کے لیے میدان فراہم کرے گی اور ان اعلیٰ انسانی قدروں کی علم بردار ہوگی جن کی شہادت ہمارے صوفیوں نے دی ہے۔

☆☆☆